زیف سید کے ناول گل مینہ، کا تنقیدی تجزیہ؛ عصری تناظر میں

Gul Meena by Zaif Sayyed in Contemporary Perspective.

ڈاکٹر عذرا پروین
شعبہ اُردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

Abstract

Literature is said to be the reflection of society whereas a story-teller is said to be the eyewitness of society. Even though a historian has, since the ancient times, been documenting the rise and fall of nations and political upheavals in true letter and spirit, but in the light of new critical discourse and consciousness of the present era, the witness of author or story-writer or a novelist has relatively more authenticity and certification in this respect that a novelist, as compared to the impassive description of a historian, delineates such a sensitive contemporary panorama in his tales, that it has diverse possible dimensions of life in it; moreover, a novelist, through his perception and insight, is able to discern the legendary pick of the lush-green valley of love even in case of hateful barren lands of warfare and cruelty whom the historian regards dead and inanimate; whereas a novelist deems the sprouts of love to be the most essential and basic cause of the creation of universe".Gul Meena", novel of Zaif Syed, is also the same sort of legend of love and infatuation of Zarjaan and Gul Meena, who belong to the tribal Pashtun regions. This is a tale of colonial imperialism, of the exploitative scams of foreign powers and of the desired interpretation of religion by native warring organizations, growing increasingly in tribal areas of Pakistan; rather it's an ultimate strife to sing a love-song in this frightful atmosphere. A contemporary proof of the incurable terrorism, prevalent in Pakistani tribal areas, this novel, " Gul Meena", even artistically proves the dexterity and alacrity of the tale-teller. This novel can surely be credited as an important addition to the tradition of Urdu novels based on the depiction of contemporary history. The article under discussion

presents this core issue of the novel in the form of analysis.

کلیدی الفاظ۔ وائس آف امریکہ، بی بی سی، شاہد نواز، راولپنڈی، وکیپیڈیا، مانسہرہ، فکشن ہاؤس

زیف سید عصر حاضر کے ایک باشعور کہانی کار، عمدہ مترجم و کالم نگار اور بہترین شاعر ہیں۔ وائس آف امریکہ، بی بی سی اور انڈیپنڈنٹ اُردو پر لکھے گئے کالم و مضامین اُن کے تعارف کا ایک اہم اور مستند حوالہ ہیں۔ باگڑیاں ضلع مانسرہ میں پیدا ہونے والے اس کہانی کار کا اصل نام ظفر سید ہے جبکہ وہ زیف سید کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔(۱) زیف سید کا پہلا ناول 'آدھی رات کا سورج' کے نام سے اردو افسانوی نثر کے افق پر ۲۰۱۳ء میں نمودار ہوا جسے فکشن ہاؤس لاہور نے شائع کیا۔ اس ناول میں اسپین کے مسلمانوں کے عروج و زوال اور یورپی تہذیب پر ان کے اثرات کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔

گل مینہ، زیف سید کا دوسرا ناول ہے جو رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔ ۸۷ ابواب اور چار سو صفحات پر مشتمل اس ناول کا آغاز مرکزی نسوانی کردار گل مینہ، کے گھر سے فرار کی داستان سے ہوتا ہے۔ جسے دادا کی وفات کے دو تین دن بعد اس کے بھائی علاقے کے رواج کے مطابق پچاس ہزار روپے ولور کے عوض ملک عطا اللہ جان کے ساتھ رُخصت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ گل مینہ کے پاس ملک عطا اللہ جان سے شادی نہ کرنے اور نفرت کرنے کی کئی وجوہات ہیں۔

"ارے کون سی دُلہن، کیسی دُلہن؟
گل مینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھی ملک عطا کی
جس نے مس فرزانہ کو علاقے سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا
اور جو آج تک ہمارے سکول میں گائے بھینسیں باندھتا ہے؟
وگمہ بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ میں جانتی ہوں گل مینہ۔
لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ خُدا کی یہی مرضی ہے۔ ہم عورت ذات اور
کر بھی کیا سکتی ہیں، بس صبر شکر کرنا پڑے گا"(۲)

رسوم و رواج اور روایات کے نام پر تدبیر کرنے والے ناخداؤں سے سمجھوتہ نہ کرنے والی پشتون گُل مینہ، جب ایک رات بارہ بجے بغل میں کپڑوں کی گٹھڑی دابے اور کندھوں پر اپنے دادا پاؤ جان کی تھری ناٹ تھری کی بندوق لٹکائے گھر میں سب کو سوتا چھوڑ کر نکلتی ہے تو یوں گماں ہوتا ہے کہ یہ ناول قبائلی روایات و رسوم و رواج کی بھینٹ نہ چڑھنے والی مگر نسائی شعور کی حامل پشتون لڑکی کی کہانی پر مشتمل ہے تاہم اگلے ہی باب میں ہمیں فلیش بیک کی ٹیکنیک میں جب قلعہ وانا سے برطانوی فوج کے میجر رسل کا اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ

رخصتی کا بھرپور نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس ناول میں قبائلی لڑکی گُل مینہ کی داستانِ محبت کے جلو میں پاکستان کے شمال مغربی سرحد اور اس سے ملحقہ علاقوں میں زمانوں سے چلے آئے ظلم و ستم، لُوٹ مار، وحشت و بربریت اور دھوکہ دہی پر مبنی کئی ایسے واقعات کو پیش کیا گیا ہے جن میں حسن بن صباح کے سادہ لوح فدائین کو دھوکہ دیتی فرضی جنت بھی ہے اور احمد شاہ ابدالی کی لُوٹ مار بھی، قلعہ وانا سے برطانوی سپاہ کا قیام و خروج بھی ہے اور مقامی و غیر مقامی مجاہدین و طالبان کے دہشت گردی پر مبنی ایسے کئی تاریخی واقعات و کردار بھی جنہیں ترتیب وار اس دلچسپ انداز، سادہ زبان اور شستہ اسلوب میں کرب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے محبت کی اس سرزمین کو کس طرح روز ازل سے دہشت گردی کا مرکز بنایا جاتا رہا ہے۔

ناول کے تیسرے باب میں وزیرستان کے علاقہ موسیٰ نیکہ میں کابل سے آنے والے مجاہدین بالخصوص مُلا حسن جان وزیرستان کے مقامی سادہ لوح مسلمانوں کو یہ خوشخبری سُناتا نظر آتا ہے کہ اُن لوگوں نے اپنے ملک سے طاقت ور روسی کافروں اور بیرونی قوتوں کو نکال باہر کیا ہے اور اب وہ اپنے ان قبائلی بھائیوں کے لیے بھی ان قوتوں کے خلاف جہاد کا پیغام لائے ہیں۔

> ”میرے بھائیو! اُٹھ کھڑے ہو اور وزیرستان میں جگہ جگہ قائم
> انگریزوں کی چوکیوں پر قبضہ کر کے وہاں سے اسلحہ اور رسد حاصل کرو
> اور ان کی مدد سے ہندوستان پر ہلہ بول دو(۳) .

اگر ہم پاکستان میں سیاسی و سماجی صورتحال اور روز افزوں دہشت گردی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے آغاز تک پاکستان میں دہشت گردی کی صورتحال اس قدر پیچیدہ اور نازک نہ تھی جس طور اس دہائی کے اختتام تک ہوتی چلی گئی۔ اس دہشت گردی سے متاثر ہونے والے حصوں میں صوبہ بلوچستان اور ملک کا شمال مغربی حصہ سرفہرست ہیں جن میں روا اندرونی و بیرونی طالبانائزیشن (کہ اب یہ ایک مخصوص مائنڈ سیٹ ہے) نے ملک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

ناول کے اگلے ابواب میں کُرم ایجنسی کی طرف پیش قدمی کرتے اور عالم کوٹ کی تلاش میں نکلے گُل مینہ اور زرجانان لاعلمی میں پاکستان سے نکل کر پکتیکا (افغانستان) میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ طوفانی رات ایک غار میں گزارتے اور بارودی دھماکے سے بال بال بچتے ہیں اور ایک مقامی افغانی سنگین خان سے ملتے ہیں جو ایک طرف تو پکتیکا میں رُوسی کافروں کی بچھائی بارودی سرنگوں کو اُن کے آبادی کو ویرانے میں بدلنے کی چال سمجھتا ہے جب کہ دوسری طرف وہ خود افغانیوں کے آپسی تعلقات و خانہ جنگی اور ہوس اقتدار کو بھی افغانستان کی تباہی کے لئے موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرجانان جب سنگین خان سے پوچھتا ہے کہ افغان حکومت اس

روسی گولہ باری کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتی اور دشمن کی بارودی سرنگوں کو مٹاتی کیوں نہیں تو جواباً وہ پھٹ پڑتا ہے اور کہتا ہے۔

"بھائی، تم بھی بہت سادہ ہے! سنگین خان چلتے چلتے رک کر کھڑا ہو گیا۔
کون سا افغانستان اور کون سی حکومت کی بات کرتا ہے؟
اس وقت افغانستان ایک ملک نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سینکڑوں چھوٹا چھوٹا افغانستان ہے کابل میں نحیبستان ہے، خود شہر سے باہر نہیں نکل سکتا، خود کو ملک کا صدر کہتا ہے۔ کابل کے باہر حکمت یارستان ہے، شمال میں مسعودستان ہے۔ ادھر ہرات کی طرف اسماعیلستان ہے۔ دوسری ولایتوں میں دوسرے ستان ہیں، ہماری پکتیکا ولایت میں کالے سفید کے مالک جنگی سردار ہیں جن کا کام صرف اور صرف لوٹ مار ہے"(۴).

بعد ازاں پتہ چلتا ہے کہ اسی سنگین خان کی مدد سے گل مینہ اور زرجانان کی شادی ہو جاتی ہے اور یہ نیا شادی شدہ جوڑا روزگار کے حصول کے لئے ارغنداب (قندھار) آ جاتا ہے جہاں زرجانان ٹیکسی چلانا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہاں کے مقامی طالبان نے پورے علاقے میں خوف وہراس کی ایسی فضا بنا رکھی ہوتی ہے کہ اُن کی موجودگی ہی عام شہریوں کا سکون تہہ وبالا کر دیتی ہے۔ اور ان پر زندگی کا دائرہ تنگ کیے ہوتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زرجانان کے گھر سے چلے جانے اور رات گئے واپس آنے پر پیچھے گھر میں تنہا رہ جانے والی گل مینہ جب زرجانان کو ریڈیو ٹھیک کروانے کا کہتی ہے تو وہ اُسے یہ بتا کر ریڈیو ٹھیک کروانے سے انکار کر دیتا ہے کہ اگر طالبان نے اس کے ہاتھ میں یہ ریڈیو دیکھ لیا تو وہ بے وقت مارے جائیں گے کیونکہ اس سے وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم اس پر گانے سنتے ہیں۔ دہشت گردی کا معروف حربہ ہی ایسا ماحول اور فضا تشکیل دینا ہوتا ہے جس سے عام شہری سیاسی، سماجی اور معاشی پسماندگی کے ساتھ نفسیاتی اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہو کر رہ جائیں کیونکہ دہشت گردی

"اپنے مکروہ مقاصد کے لئے خواہ وہ اغوا برائے تاوان کی صورت میں ہو، بیٹیوں، ماؤں، بہنوں، بیویوں اور خواتین پر ظلم اور ہراس کی صورت میں ہو، قتل کی صورت میں ہو، دہشت پھیلا کر ناجائز طور پر مال کے حصول کی صورت میں ہو، بھتہ خوری کی صورت میں ہو، دہشت اور خوف و ہراس پیدا کر کے کسی کی جائیداد ہتھیانے کی صورت میں ہو، ریاست کا اپنے شہریوں پر ظلم کرنے اور اُنہیں قتل

کرنے کی صورت میں ہو، ایک طاقت ور ریاست کا دوسری کمزور ریاست کے کمزور لوگوں پر ظلم و ستم کرنے اور اُنہیں قتل کرنے کی صورت میں ہو یا پولیس کا ماورائے عدالت جعلی پولیس مقابلے میں لوگوں کو مارنے کی صورت میں ہو، ایسا عمل جس سے کسی بھی معاشرے، ملک، شہر، گاؤں، قصبہ، گلی، محلہ، خاندان کے لوگوں اور کسی فرد میں خوف و ہراس اور دہشت پھیلے دہشت گردی کہلاتا ہے"۔

(۵)

مقام افسوس ہے کہ اس جدید دور میں بھی جہاں فنونِ لطیفہ جرم ہو اور دُنیا کے حوالے سے باخبر رہنے کی خواہش کو گناہ سے تعبیر کیا جائے وہاں یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دیر نہیں لگتی کہ ایسے علاقوں میں بسنے والوں پر زندگی کا دائرہ کس قدر تنگ ہوتا ہے۔

"زرجانان انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک گاڑی میں ہلچل ہوئی اور عورتیں بچوں کو اُٹھا کر تیزی سے گاڑی سے نیچے اُتر گئیں۔ سب سے آخری سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا کھڑکی میں سے ہی نیچے کود گیا۔ کنڈیکٹر ایسا غائب ہوا کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا کدھر گیا۔ زرجان ابھی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیاہ پگڑیاں باندھے، کندھوں پر کلاشنکوفیں لٹکائے ساتھ آٹھ مرد گاڑی میں داخل ہو گئے"(۶).

بعد ازاں ہم دیکھتے ہیں کہ زرجانان بھی زیادہ منافع اور معاشی آسودگی کی خاطر انہی طالبان کے لئے کام کرنے لگ جاتا ہے لیکن آنیوالے دنوں میں ایک بارودی دھماکے میں مارا جاتا ہے۔ انیسویں باب میں ناول نگار اپنے قارئین کو ایک نئے کردار سے متعارف کرواتا ہے۔

شفیق پینٹر کہ جس کے ہاتھ میں قدرت نے ایک خاص مہارت رکھی ہوئی ہے اور ماضی میں جس کے ہاتھوں سے بنائی گئی ٹرکوں کی باڈی پر فلمی دوشیزاؤں کی تصاویر پر جنت کی حوروں نیز خوبصورت مناظر کی سینریوں پر جنت کا گمان گزرتا ہے لیکن طالبان کے ہراساں کرنے پر شفیق پینٹر جب ٹرکوں پر فلمی دوشیزاؤں کے پوسٹر بنانے کی بجائے جنت ایسے روح پرور نظاروں کی سینریاں بنانے لگ جاتا ہے تو انہی طالبان کے بنائے ہوئے مدرسے کا خطیب شفیق پینٹر کو اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے اُسے اپنے مدرسے میں لے آتا ہے اور مدرسے کی دیوار پر مصنوعی جنت کے دلکش منظر بنانے کا کہتا ہے تاکہ وہ ناپختہ نوجوانوں کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر سکے اور ایک خاص طرح کی ذہن سازی کے بعد انہیں خودکش دھماکوں پر آمادہ کر سکے۔

نوجوانوں کو خود کش دھماکوں پر آمادہ کرنے کے لئے خطیب صاحب کے کہنے پر مدرسے کی دیوار پر جس نوجوان کی مدد سے شفیق پینٹر حسن بن صباح کی مانند مصنوعی جنت کے مناظر بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ گل مینہ اور زرجانان کا بیٹا فتح خان ہی ہے کہ جسے خطیب صاحب ایسا دہشت گرد خود کش دھماکے کے لئے یہ کہہ کر تیار کرتا ہے کہ اس طرح وہ روزِ قیامت اپنے والدین کی بخشش کا باعث بن سکے گا۔

نوجوانوں کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے اور خاص طرح کی ذہن سازی کے بعد انہیں خود کش دھماکوں پر آمادہ کرنے کے لیے یہ طالبانی گروہ فتح خان ایسے کتنے ہی بھولے بھالے، لڑکپن اور نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے بچوں کے جذبات کو مہمیز دے کر اُن کے ذریعے مخصوص مقاصد / اہداف حاصل کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم خطیب صیب (صاحب) کے فتح خان سے ہونے والے مکالمے سے لگا سکتے ہیں۔

"خطیب صاحب بولے:

> فتح خان میں تمہارے دُکھ اور تمہارے آنسو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔۔۔ لیکن میرے نزدیک تم جس شیر نر کے بچے ہو۔ اُس کا تقاضا یہی ہے کہ آنسو بہانے کی بجائے تم اپنے باپ کے لئے کچھ کرو۔ کچھ ایسا کرو جس کے بعد جب تمہاری اس سے جنت میں ملاقات ہو تو وہ تم پر فخر کر سکے کہ شیر نے واقعی شیر کے بچے کو جنم دیا تھا" (۷)

ہم جانتے ہیں کہ جہاد و شہادت کے ساتھ وابستہ ایسی خوش نما تعبیریوں اور دلکش معنی و مفاہیم کے بدولت ہی ان جہادی تنظیموں نے وطن عزیز کے شمال مغربی حصہ میں جو بھیانک اور ہولناک کھیل کھیلے، معصوم اذہان کو جس طور جنگی جنون میں مبتلا کر کے اشتعال دلایا، معاشرے میں اختلاف رائے کو مخالفت قرار دیتے ہوئے عدم برداشت کے جن رویوں کو پروان چڑھایا اور دشمن کو نیست و نابود کر کے دائمی جنت کے جو خواب دیکھائے ان کی تعبیر بہت بھیانک ثابت ہوئی۔ زرجانان کی شہادت کے بعد گل مینہ اور زرجانان کا بیٹا فتح خان بھی اسی لیے ان جہادی تنظیموں کا مرکز نگاہ بنتا ہے۔

بقول رویس احمد:

> "قبائلی علاقوں میں پنپنے والی ان جہادی کاروائیوں کا دائرہ کار جب پاکستان کے میدانی علاقوں میں پھیلا اور دشمن ممالک نے اپنے مقاصد کے لیے ان گروہوں کی سربراہی کی۔ تب ان چند مفاد پرستوں نے کیسے ان معصوم بچوں کو جہاں کا سبق پڑھایا۔ ان معصوم کا نمائندہ کردار

فتح خان ہے جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد مدرسہ میں آیا مگر دہشت
گرد بن کر باہر آیا"۔(۸)

ناول میں حسن بن صباح کی مصنوعی جنت کے تاریخی حوالے کے متوازی ناول نگار احمد شاہ ابدالی کی لوٹ مار کی تاریخ کو واقعاتی انداز میں پیش کرتا رہتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناول نگار نے فلیش بیک کی ٹیکنیک کیوں استعمال کی جس کا واضح جواب یہ ہے کہ ناول نگار تاریخی و جغرافیائی حقائق کے حامل اس ناول میں مختلف زمانوں اور تاریخ کے ذریعے مختلف کرداروواقعات کی مدد سے ظلم وبربریت اور دہشت گردی کی جو فضا کو تشکیل دینا چاہتا ہے اُس کے لئے بہ یک وقت اُسے مختلف زمانوں سے جڑنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ حسن بن صباح کی طرح خطیب صاحب کا فرضی جنت کے ذریعے سادہ لوح اور مجبور و بے بس افراد کو ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر کے اُنہیں اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنا، احمد شاہ ابدالی کا اپنے ساتھیوں کی حمایت حاصل کر کے محبت و امن کے حامل علاقوں میں ظلم وبربریت اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنا اور اپنے خوشیوں کے محلات تعمیر کروانے ایسے واقعات، قبائلی علاقوں میں برطانوی راج اور مقامی مجاہدین کی اُن کے خلاف شورشیں، طالبان کا دہشت گردی کی فضا تیار کر کے لوگوں کا جینا محال کرنا وغیرہ ایسے سلسلہ وار واقعات کی پیشکش دراصل ماضی کو حال کے تناظر میں دیکھنے کی خواہش ہے اس پر مستزاد مشاہدے اور تجزیے کی صلاحیت ناول نگار کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے کہ اُس کی سرزمین کے جس کا مسئلہ محض روزگار و محبت تھا، کو کبھی دہشت گردی تو کبھی اسلامائزیشن کے نام پر بے جا عالمِ جنگ میں دھکیلا گیا نیز خوف و ہراس کی فضا تشکیل دے کر اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لوٹ مار کا بازار گرم کر کے اُسے ویرانے میں بدل دیا گیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ زندہ اور بامعنی ادب کی اپنی سرزمین، عہد اور سماج کے ساتھ جڑت ہمیشہ مضبوط ہوتی ہے کہ اپنے عہد و سماج سے بے نیاز محض تخیل کے بگٹٹ رنگین گھوڑے دوڑانے والے ادیب کا موضوع سماج یا اس کے حقائق نہیں ہوتے بلکہ خیالی بزم آرائی ہوتا ہے جبکہ اپنے سماج و عہد کے حقائق سے عہدہ براہ ادیب جب اپنی باریک بینی، قوت مشاہدہ اور تجزیاتی صلاحیتوں کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لاتا ہے تو پھر اس کا تخلیقی سرمایہ معاصر صورتحال کا بہترین عکاس اور حقائق کی متنوع امکانی صورتوں کا شاندار علمبردار بن کر سامنے آتا ہے اور ایسی ہی تجزیاتی صلاحیتوں اور قوت متخیلہ کی ہم آہنگی 'War and Peace' ایسے شاہکار تخلیق کرواتی ہے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"ادیب جب اپنے عصر کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے اندر تخلیقی مشین متحرک ہو کر اُسے رُوحِ عصر سے ہم رشتہ کر دیتی ہے۔ پھر جب ادب تخلیق کرتا ہے تو اس میں محض ان دونوں کا امتزاج نہیں ہوتا بلکہ تخلیق کار کی اپنی ذہانت کی آمیزش سے ایک ایسی شے خلق ہو جاتی ہے جو بے مثال بھی ہوتی ہے اور لازوال بھی"۔(۹)

خوف و ہراس اور دہشت گردی کے علمبردار یہ طالبان ایک طرف تو معاشی مجبوریوں میں جکڑے، سگے باپ کی محبت سے محروم ہونے والے اور جذباتی نا آسودگیوں کے شکار فتح خان ایسے نو آموز نوجوانوں کو اپنی لچھے دار باتوں میں اُلجھا کر اور ان میں مذہبی جذبات اُبھار کر اُنہیں ایک ان دیکھی جنت کے خواب دکھاتے اور انہیں نام نہاد جذبہ جہاد و شہادت کے لئے تیار کرتے ہیں جب کہ دوسری طرف حسن بن صباح کی مانند مدرسے کی دیوار پر مصنوعی جنت کی تیاری کے لئے شفیق پینٹر ایسے کاریگروں کو بھی اغوا کر کے ان کے ذریعے مطلوبہ اہداف حاصل کرتے ہیں۔ ہر دو مقاصد کے نتیجے میں موت ان جوانوں کا مقدر بنتی ہے۔

بقول صلاح الدین درویش:

"زیف سید نے اپنے اس ناول میں حسن بن صباح کی تحریک اور افغان جنگ کے مقدس بیانیوں میں جس مماثلت کو دریافت کیا وہ تاریخی اعتبار سے محض فدائین سے لے کر خود کش بمباروں تک کا ہولناک سفر نہیں ہے بلکہ ہر دو معاشروں میں موجود بڑے بیانیوں کی وہ کڑیاں بھی ہیں کہ جن کی اسناد زمان و مکان کی قیود میں کبھی چیلنج نہ ہو سکیں اور نہ ان پر سوالات اُٹھائے جا سکے۔ جنت حسن بن صباح کی بسائی ہوئی ہو یا ٹرک باڈی پینٹر شفیق کی بنائی ہوئی دونوں جنتوں کا حصول صرف ایک چیز مانگتا ہے اور وہ ہے موت"(۱۰)

جذباتی اور شہید ہونے والے باپ کی محبت میں بے بس کر دینے والی "خطیب صاحب" کی باتیں فتح خان کو خود کش دھماکے پر آمادہ کر کے اسے لیاقت باغ لے جاتی ہیں۔ یہاں ناول نگار فتح خان کے دل و دماغ میں جاری اس کشمکش کو بھی واقعاتی رنگ میں دکھاتا ہے کہ جس کے تحت فتح خان یہ سوچتا ہے کہ وہ جس عورت کو قتل کرنے آیا ہوا ہے وہ تو اُس کی ماں کی پسندیدہ شخصیت ہے کہ جسے وہ ملکی مسائل کا واحد حل سمجھتی ہے۔ لیکن نفرت کا زہر اگلتی خطیب صاحب کی زبان تو اسے کچھ اور ہی فسانہ سناتی نظر آتی ہے۔

"تو میرا مشن اِس عورت کو ختم کرنا ہے، فتح نے سوچا۔ لیکن خطیب صاحب تو مسلسل یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ اُسے اسلام کے ایک

بدترین دشمن اور ذلیل ترین منافق کو جہنم رسید کرنا ہے جس نے
امریکہ کے ساتھ مل کر دُنیا بھر کے مسلمانوں کی زندگیاں حرام کر
رکھی ہیں"(۱۱)

یہی وہ متشدّد ذہن سازی ہے جس کی بدولت عالم اسلام کے پیغام امن کو من گھڑت توجیہات و ترجیہات کے ساتھ دنیا میں مشکوک بنایا گیا اور مطلوبہ اہداف کے حصول کے لیے لوگوں کو از خود کافر و ملحد قرار دیا گیا۔ اور دائرہ اسلام سے دخول و خروج کا استناد بخشا گیا ناول "گل مینہ" کے مصنف کا مطمع نظر ہی ان مذموم ذہنیت کے حامل کرداروں اور تنظیموں کو بے نقاب کرنا ہے جو ہر حساس ادیب کی طرح طبقاتی تفریق، منافقت و منافرت سے پاک اور محبت سے لبریز معاشرے کا خواب دیکھتا ہے اور اپنے عہد و زمانے کا نوحہ اور آشوب پیش کرنا زیف سید کا بھی آدرش رہا ہے۔ اسی لیے تو رشید امجد نے کہا تھا۔

"میں اس لیے لکھتا ہوں کہ اپنا اظہار چاہتا ہوں۔ اپنے عہد اور اس کے
آشوب کو لفظوں میں زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدرش کی تکمیل چاہتا
ہوں کہ کبھی تو وہ غیر طبقاتی آئیڈیل معاشرہ وجود میں آئے گا جہاں
میں اور مجھ جیسے سب سر اُٹھا کر چل سکیں گے۔ ہمیں کوئی فتح کرنے والا
نہیں ہوں گا، ہماری رائے کی اہمیت ہو گی۔ یہ خواب سہی، میری بات
تمنائیں سہیں لیکن میری تحریروں کا اثاثہ یہی خواب اور یہی تمنائیں
ہیں"(۱۲)

فتح خان کے خود کش دھماکے کے بعد شفیق پینٹر، خود فتح خان اور اُس کی لاچار ماں جس المناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں، یہ ناول نگار کا کہانی کو کسی موڑ یا نتیجے تک لانے کی شعوری کوشش ہو سکتی ہے تاہم مصنف کا اصل ہدف یہ نہیں ہے بلکہ نفرت کی اُس آگ کو بے نقاب کرنا ہے جس کا ایندھن ہماری نوجوان نسل کو بنایا جا رہا ہے ناول نگار یہ بھی دکھاتا ہے کہ کس طرح جہاد کے نام پر خود کش دھماکوں کی نذر ہو جانے والے طالبان اپنے بعد اپنے بیوی بچوں کو اُس وقت بے بس و محتاج اور بیوہ و یتیم کر کے چھوڑ جاتے ہیں جب اُنہیں اُن کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

ناول 'گل مینہ' کے سلسلے میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بلاشبہ تاریخی شعور کا حامل یہ ناول جو اپنے اندر بہترین جزئیات نگاری اور شستہ اسلوب کی خوبیاں لئے ہوئے ہے، تاریخی ناول قطعاً نہیں کہ تاریخی ناول اپنے مخصوص اور نپے تُلے اہداف کے حصول کے لئے جس سستی جذباتیت، سپاٹ صورتحال اور تشکیلی سچ (ہائپر ریئلٹی) کو کہانی میں پیش کرتا ہے، گل مینہ اُس صورتحال سے کُلّی طور پر مبرّا ناول ہے کیونکہ زیف سیّد اس

ناول میں نسیم حجازی، ایم اسلم اور اسلم راہی کی طرح محض سپاٹ یا اکہری تاریخ پیش نہیں کرتے بلکہ وہ مؤرخین کی پیش کردہ اکہری تاریخ کے مقابلے میں ایک ایسی متوازی عصری و تاریخی صورتحال پیش کرتے ہیں جو ایک طرف تو تعصب یا جانبداری کے باعث مصلحتوں کا شکار نہیں ہونے پاتی جبکہ دوسری طرف ان کی قوت متخیلہ سے ترتیب پاتے تخلیقی سوتے ناول کی متنوع امکانی صورتوں کو بھی قاری پر منکشف کرتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ ناول 'گل مینہ' کا پلاٹ اس قدر منضبط و منظم اور سلجھاؤ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ پے در پے ظلم و بربریت اور دہشت گردی کا شکار ہوتی نسلیں ایک ہی تسلسل کا حصہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ تاریخی و عصری شعور کے اس دلکش ادبی پیرائے کے حامل ناول ''گل مینہ'' میں پیش کی گئی قرین قیاس صداقتیں قاری کو کلی طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

یہی کسی ناول نگار کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ سماجی حقائق کو اپنے متخیلہ کی آمیزش سے اس طور پیش کرتا ہے کہ کشاکش زندگی کا ایک بھرپور منظر نامہ تیار ہو جاتا ہے۔ جسے اپنے عہد کی معتبر تاریخی مگر ادبی دستاویز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور چونکہ ناول نگار مؤرخ کی طرح شعوری طور پر تاریخ رقم نہیں کر رہا ہوتا۔ لہٰذا عمومی طور پر وہ تعصب اور جانبداری کا بی شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے ناول کو کسی پروپیگنڈہ مہم کا شکار ہونے دیتا ہے۔(۱۳)

ناول 'گل مینہ' میں بھی عصری صورتحال سے جنم لیتے دہشت گردی کے ناسور کی عکس گری کرتے ہوئے زیف سیّد کا قلم نہ تو خام اور سطحی جذباتیت کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کہیں پر مصلح و ناصح بن کر پند و موعظت سے اپنی تخلیقی تحریر کو آلودہ ہونے دیتے ہیں۔ ان کے ناول میں تاریخ و سماج اور تخیل کا میل رواں قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بقول ادریس بابر:

> ''گل مینہ اور زرجانان کے رومان کی کشش جہت داستان پھیلتے پھیلتے بہت سی زمینوں، زمانوں اور ان پر مبنی افسانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ کرداروں کے خاندانی خواص سے قبیلوں کے جنگی رجحانات تک اتنی کہانیوں، اتنے بیانیوں کے تار پود بکھرتے اور سمٹتے دکھائی دیتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے''(۱۴)

ناول ''گل مینہ'' اندرونی و بیرونی سازشوں، استحصالی ہتھکنڈوں اور دہشت گردی کی فضا میں محبت کا گیت گانے کی ایک مقدور بھر کوشش ہے۔ گویا یہ ناول فنی و فکری دونوں اعتبار سے کہانی کار کی مہارت اور چابکدستی کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا ہے لہٰذا اس ناول کو پاکستانی عصری تاریخ کی بیان پر مبنی اُردو ناولوں کی روایت میں ایک اہم اور معتبر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ تہمینہ بشیر، زیف سیّد کی ناول نگاری: تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے بی ایس اُردو (ملتان، شعبہ اُردو، بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۲۰ء)، ص ۲
۲۔ زیف سیّد، گل مینہ (راولپنڈی، رمیل ہاوس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۹۴
۳۔ ایضا"
۴۔ ایضا"
۵۔ دہشت گردی، آزاد دائرہ المعارف، ویکیپیڈیا https:ur.m.wikipedia.org,wiki
۶۔ زیف سید، گل مینہ، ص ۱۴۷
۷۔ ایضاً، ص ۳۴۷
۸۔ رویس احمد، "گل مینہ" از زیف سیّد (تبصرہ)، ہم سب https://www.humsub.com.pk۸
۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "ادب میں عصریت کا مفہوم"، ذہن جدید (سہ ماہی، مئی ۱۹۷۶):۵۵
۱۰۔ صلاح الدین درویش، گل مینہ (تبصرہ)، بک کارنر https://www.bookcornre.com.pk
۱۱۔ زیف سید، گل مینہ، ص ۳۹۵
۱۲۔ رشید امجد، تمنا بے تاب (راولپنڈی، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۷۶
۱۳۔ شاہد نواز، پاکستانی اُردو ناول میں عصری تاریخ (شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۸ء)، ص ۳۰
۱۴۔ ادریس بابر، "گل مینہ" کی تلاش میں (تبصرہ) https//urdu.nayadaur.com